ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.6,Issue No.1(2024)
(January to March)

ناول "راجہ گدھ" میں سماجی مسائل کی عکاسی

Depiction of Social Issues in the Novel "Raja Gidh"

رضا اکرم
ایم۔فل، شعبہ اُردو، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان
زاہدہ ملک
ایم۔فل، شعبہ اُردو، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان
ڈاکٹر منور امین
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اُردو، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب، ملتان

Raza Akram
M.Phil, Department of Urdu ,Institute of Southern Punjab, Multan
Zahida Malik
M.Phil Department of Urdu, Institute of Southern Punjab, Multan
Dr. Munawar Amin
Assistant Professor, Department of Urdu,Institute of Southern Punjab, Multan

Abstract:
"Raja Gidh" is a unique novel written in symbolic style but it is a versatile novel. This novel also has a new style of sexism. Sociological ideas were presented in this way for the first time in a novel. Then it is so difficult to analyze internally the situation of the life problems of the classes with a slightly better economic position which are completely different from the people suffering from uneven economic conditions. Even the idea of such a lively creation on this subject was extinct. Gulbarga Society The society, the bureaucrats' personal lives and their children's lives, the psychological effects of class conflict, especially in colleges and universities, the fast-paced race to shape their future away from home, mounting problems, the question of status, all these confuse the young generation with frustration.

Keywords: Raja Gidh, symbolic style, internally, Gulbarga Society, universities, frustration, acceptable, composition.

"راجہ گِدھ" بانو قدسیہ کا ایک شاہکار ناول ہے جو ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا۔ اس ناول میں بانو قدسیہ نے علامتی اُسلوب کو ایک نئے تجربے سے آشنا کیا۔ اس ناول میں بانو قدسیہ کی تخلیقی صلاحیتوں کے جوہر اپنی پوری آب و تاب پر دِکھائی دیتے ہیں۔ یہ ناول موضوعاتی تنوع رکھتا ہے اور اس ناول کا مطالعہ نفسیاتی، علامتی اور ہیئتی اعتبار سے تخلیقی اظہار کے جدید پہلوؤں سے آشنا کرتا ہے۔ سماجی مسائل کے پیچھے نفسیاتی محرکات کا احاطہ کرنا کبھی بھی آسان کام نہیں رہا لیکن بانو قدسیہ نے بے رحم حقیقت نگاری کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے اس عمل کو سرانجام دے کر اپنی فنی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار کیا ہے۔ اس نقطہ نظر سے بانو قدسیہ کو جتنا بھی خراجِ تحسین پیش کیا

جائے وہ کم ہے اور سماجی مسائل کے جن ماخذات کا تذکرہ بانو قدسیہ نے اس ناول میں پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ بہت سے اعلیٰ سے اعلیٰ تخلیق کار بھی اتنی ہمت پیدا نہ کر سکے۔ یہ ایک طرح سے ہماری اشرافیہ کی بے راہ روی اور وائٹ کالر کرائم کا ایک رُخ ہے جو حقائق کی ایک تلخ لیکن سچی تصویر پیش کرتا ہے۔ اس طرح کے سماجی مسائل ہماری زندگی میں اتنے بڑھ چکے ہیں کہ روزانہ اس طرح کی صورتحال سے دوچار کئی افراد ہماری نظروں سے گزرتے ہیں۔ ہمارے مشاہدے میں آتے ہیں اور کئی زندگیاں برباد ہوتی ہم اپنی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ معاشرے کے مسائل جس نوعیت کے بھی ہوں ان کی پردہ پوشی سے کبھی بھی ان سے چھٹکارہ نہیں پایا جاتا۔ البتہ اس طرح کے مسائل کو پوری سچائی سے سامنے لا کر اور معاشرے کے افراد کو ان پر غور و فکر کی دعوت دے کر اور ان کا حقیقت کے ساتھ بھرپور پوسٹ مارٹم کر کے افراد اور معاشرے کو ان مسائل اور ان مسائل کے اسباب کا سدِباب کرنے میں ان کی حوصلہ افزائی کی جاسکتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کہتے ہیں:

> "بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گِدھ" ایک ایسے دَور میں سامنے آیا جب ہمارے معاشرے میں ذات کی شکست و ریخت، اخلاقی زوال اور بے سمتی کا نمایاں احساس پایا جاتا ہے۔ یہ احساس اس پر آشوب دور میں اس بات کی علامت ہے کہ ہمیں اس امر کا ادراک ہو چکا ہے کہ ہماری اقدار اندر سے اس قدر سڑ گل چکی ہیں کہ اگر صورتحال میں تبدیلی کا اہتمام نہیں کیا گیا تو معاشرہ اپنی موت سے ہمکنار ہو جائے گا جس کا صریحاً مطلب یہ ہو گا کہ انسان زبردست ارتقا کے باوجود اپنی ذات کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے جبکہ جبلی طور پر وہ ہدایت کی خواہش کرتا رہا ہے۔"(۱)

جدید طرزِ زندگی اپناتے ہوئے ہماری آسودہ حال طبقے کی نوجوان لڑکیاں اور لڑکے ہماری معاشرتی اقدار کو فرسودہ اور پرانی روایات قرار دیتے ہوئے ذہنی تفریح کی تلاش میں جب اخلاقی حدود کو غیر اسلامی انداز میں پھلانگنے کی کوشش کرتے ہیں تو بجائے تفریح اور ذہنی و جسمانی آسودگی حاصل ہونے کے قلبی عدم اطمینان کا شکار ہو جاتے ہیں اور بجائے اسلامی و اخلاقی اور فطری طرزِ زندگی کی طرف لوٹنے کے جنسی بے راہ روی کا شکار ہوتے چلے جاتے ہیں جس کے بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں اور بانو قدسیہ نے اس ناول میں اسی صورتحال کی طرف توجہ دِلانے کی کوشش کی ہے۔ بانو قدسیہ بات کہنے کا فن جانتی ہیں اور بہت مشکل سے مشکل اور تلخ حقائق کو بہت سادگی اور پوری سچائی سے قاری کے سامنے ایک مسئلہ کے طور پر پیش کر دیتی ہیں۔ راجہ گِدھ کو کسی مخصوص طبقے کے ساتھ نتھی کرنا سراسر غیر حقیقی بات ہو گی البتہ یہ ہمارے طبقات کے جدید سماجی مسائل، نفسیاتی اُلجھنوں اور تہذیب و اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کی نشاندہی کرتا ہے جو سراسر مغربی کلچر کی اندھی تقلید کرنے کی وجہ سے اس نہج پر پہنچ چکی ہیں کہ اگر معاشرے کی روحانی اور سماجی اصلاح پر توجہ مرکوز نہ کی گئی تو مستقبل قریب میں ہماری اجتماعی معاشرتی تباہی اور بربادی کی خوفناک صورتحال پیدا ہونے کا اندیشہ ہمارے معاشرے کے سروں پر منڈلا رہا ہے۔

اس ناول کی جو سب سے خاص بات ہے وہ یہ ہے کہ بانو قدسیہ نے ہمارے اس جدید عہد کے سارے مسائل کا ایک نچوڑ پیش کیا ہے اور وہ نچوڑ یہ ہے کہ ہر سماجی مسئلہ اور صورتحال کے پیچھے کوئی نہ کوئی غیر اخلاقی، غیر فطرتی، غیر اسلامی محرک کارفرما ہوتا ہے۔ فطرت کے اُصولوں اور انسانی اقدار کی پامالی کا کوئی نہ کوئی عنصر کارفرما ہوتا ہے۔ سکون اور راحت کا بیان صرف اور صرف نظریہ اسلام کی پیروی کرنے میں پوشیدہ ہے۔ ہمارا معاشرہ ہوس پرستی اور بے راہ روی کی جس نہج پر کھڑا دِکھائی دیتا ہے اس کے محرکات اس ناول کی سٹوری کے ذریعے ان محرکات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور جدید سماجی مسائل کو حل کرنے کی راہیں بھی متعین ہوتی ہیں۔

اِس ناول کے دو رُخ ہیں، ایک رُخ وہ ہے جو براہِ راست انسانی زندگی کے کئی پیچیدہ پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے۔ ناول کا یہ رُخ نہ صرف جدید اور تعلیم یافتہ نوجوان نسل کی زندگی کی اُلجھنوں کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ اپر کلاس کے لوگوں کے سٹیٹس برقرار رکھنے اور زندگی کو بارونق رکھنے کی پُرزور کوشش جو بعض اوقات ان کی نوجوان اولادوں کی زندگی اجیرن کر دیتی ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے افراد یعنی بیوروکریٹس کی زندگی جو اپنی نوجوان اولادوں کی فکر کرنے کی بجائے ذاتی زندگی کو دولت کے بل بوتے پر آسائشات کے پیچھے بھاگتے ہیں اس سے ان کی اولادوں پر بُرے اثرات کی نشاندہی کرتا ہے اور غیر فطری جنسی خواہشات جو لامحدود ہوتی چلی جاتی ہیں، کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کی صورتحال دِکھاتا ہے بلکہ ایسے افراد جو جنسی ہوس کو قابو میں رکھنے کی بجائے مسلسل بڑھاوا دیتے چلے جاتے ہیں، کے انجام کی نشاندہی کرتا ہے اور دوسرا رُخ علامتی انداز میں جانوروں اور پرندوں کے افکار، مباحث اور خیالات کے ذریعے انسانی معاشرے میں پائی جانے والی اخلاقی برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے اس کے دور رس اثرات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک اچھے سماجی ادیب کی طرح بانو قدسیہ نے جن سماجی مسائل کی نشاندہی کی ہے ان کے حل کے لیے راستہ بھی دکھایا ہے اور ایک ایسی دلیل پیش کی ہے جو کہ بالکل اسلامی تعلیمات اور اسلامی معاشرے کی اقدار کے عین مطابق ہے۔

اس لحاظ سے ناول کا پلاٹ چند چھوٹے چھوٹے قصوں سے جو کہ آپس میں مربوط ہیں، کی کہانی پر مشتمل ہے۔ یہ قصے کہانیاں ہماری حقیقی زندگی کی درست عکاسی کرتی ہیں اور معاشرے کے ایک ایسے رُخ پر روشنی ڈالتی ہیں جن کو زیادہ سے زیادہ زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہے تاکہ جدید دَور کے اس طرز کے مسائل جو ہماری زندگی کو بہت تیزی سے متاثر کرتے چلے جا رہے ہیں، کے بارے میں سماجی شعور اُجاگر کیا جا سکے اور معاشرے کو سرمایہ دارانہ نظام اور جدیدیت کی ہولناکی سے بچا کر اپنی سچی، سادہ اور اسلامی تعلیمات کے عین مطابق صدیوں پرانی روایات، خاندانی نظام اور مذہبی و معاشرتی تشخص بحال کیا جا سکے جو کہ اگر بحال کرنے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کی جاتی ہیں تو اپنی تہذیب و ثقافت، معاشرتی، سماجی اور اخلاقی اقدار و روایات اور نوجوان نسل کا تابناک مستقبل سب کے سب تباہ و برباد ہو جانے کا اندیشہ ہے کیوں کہ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام جو کہ جس وقت یہ ناول لکھا گیا تھا۔ اَب مکمل اصلی روپ میں سامنے آچکا ہے اور یہ ایک ایسا دیو ہے جو معاشرے میں مساوات، عدل و انصاف، باہمی بھائی چارہ اور ہماری تہذیب و ثقافت اور روایات کو چند برسوں میں چاٹ کر رکھ دے گا۔ میرا جسم، میری مرضی جیسے نعرے، آئی ایم ایف کی شرائط کی لٹکتی تلواریں، اور سماجی اقدار اور ثقافتی روایات سے انحراف نوجوان نسل کو تباہ و برباد کر دینے کے لیے ایک مستقل خطرہ ہے۔ اپنی نوجوان نسل کو ان سب مضمرات سے نکالنا اور راہِ راست پر چلنے کے لیے فکری شعور دینا ہماری اخلاقی ذمہ داری ہے۔ اگر ہمارا اَدب اس ذمہ داری سے پہلو تہی کرنے کی روش پر چل پڑا تو پھر اپنے سماج کو یورپ کے رحم و کرم پر جانے سے روکنا بہت مشکل ہو جائے گا۔

اس ناول کے کرداروں میں بعض کردار انسانی ہیں جن میں مرکزی اور اہم کردار آفتاب، سیمی، قیوم اور پروفیسر سہیل کے علاوہ امتل وغیرہ ہیں، علامتی کرداروں میں پرندوں کے کردار ہیں جو دراصل انسانی کرداروں کی علامتی نمائندگی کے لیے پیش کیے گئے ہیں۔ ہر کردار مکمل اور منفرد ہے اس کے عمل اور فکر سے ناول نگار نے جو نتیجہ اخذ کرنا تھا وہ اسے اخذ کرنے میں کامیاب ٹھہرتی ہیں۔ بعض لوگوں نے بانو قدسیہ کے اس ناول کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی، لیکن ایسی لاکھوں کوششیں بھی اس ناول کے بنیادی فلسفہ کو جو رزقِ حرام اور رزقِ حلال کے انسانی موروثی خصوصیات پر اثرات کی وضاحت کرتا ہے، کو ہرگز ہرگز رد کرنے میں ناکام رہی ہیں اور ناکام رہنی بھی چاہئیں، کیوں ہمارا مذہب اور تعلیمات اور اسلام کی روح اس منطقی استدلال کی جو اس ناول میں پیش کیا گیا ہے، کی دلالت کرتی ہیں۔ ناول میں قیوم کی حیثیت ایک راوی کی ہے جو بہت سے خیالات اور افکار کو اپنی زبانی قاری تک پہنچاتا ہے۔ بانو قدسیہ کا بیانیہ

نہایت منفرد ہے جس سے یہ ناول ہمہ جہت ناول بن کر اُبھرا۔ اس ناول کو علامتی، فکری اور سماجی تناظر میں دیکھنے کے ساتھ ساتھ مغربی سرمایہ دارانہ نظام کے تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے اور جس تناظر میں بھی ناول کا مشاہدہ کیا جائے۔ یہ ناول اس تناظر میں لکھا ہوا ایک شہکار ناول بن کر اُبھرتا ہے۔ اس ناول کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر وارث علوی فرماتے ہیں:

> ''میں بہت آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتا ہوں کہ ایک عام قاری بلکہ خاصا پڑھا لکھا قاری بھی "راجہ گِدھ" سے کیوں محصور اور متاثر ہوتا ہے۔ اس تاثر کا سرچشمہ ناول کی زبان، خوبصورت بیانیہ، استعاروں اور تشبیہوں سے جگمگاتا اُسلوب، بولتے ہوئے نکیلے مکالمات، جزیات اور تفصیلات میں فنکارانہ سوجھ بوجھ، ایک پڑھا لکھا حساس اور تشنہ علم ذہن، انسانی فطرت زندگی اور کائنات کے اسرار و رموز کی تہہ پانے کی حوصلہ مندانہ کوشش ہے۔ جو ناول نگاری کو ایک سنجیدہ فلسفیانہ مشغلہ بنادیتی ہے۔''(۲)

دراصل بانو قدسیہ بھرپور ادبی تجربہ رکھتی ہیں اور یہ ناول لکھتے وقت ان کی عمر کوئی لگ بھگ ترپن برس رہی ہوگی۔ اس عمر میں تجربات کا پورا نچوڑ جو تجربات ان کی ادبی زندگی کا حاصل تھے۔ بانو قدسیہ نے اس ناول میں شامل کر دیئے یہی وجہ ہے کہ ناول کی زبان بالکل سادہ ہے۔ فلسفیانہ انداز ہونے کے باوجود بوریئت بالکل نہیں اور ہر بات کا مفہوم مکمل طور پر واضح ہے۔ ایک ایسی ادیبہ جس نے ساری زندگی بلاناغہ لکھا تشبیہات و استعارات کا منفرد اُسلوب حاصل ہونا ایک فطری عمل ہے۔ ان کی خوبی ہے وہ جیسا ماحول پیش کرنا چاہتی ہیں ویسی ہی زبان استعمال کرنے میں کامیاب رہتی ہیں۔ واقعات کو ترتیب دینے کا فن جانتی ہیں اور ہر طبقہ کے لوگوں کے طور اطوار اور تہذیب کی پیش کش حقیقی انداز میں کرتی ہیں۔ عورتوں کی روزمرہ زبان، مردوں کے گفتگو کرنے کے انداز، موضوعات سب پر کمال دسترس رکھتی ہیں۔ ان کے اندر ہمدردی بھی ہے اور سماجی مسائل کا تجربہ بھی، لہٰذا وہ اس ناول میں پیش کردہ مسائل کا صحیح حل پیش کرنے میں کامیاب ٹھہرتی ہیں۔ ناول کے کرداروں میں سیمی سب سے اہم کردار ہے اس کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں۔ بانو قدسیہ نے سیمی کی زبانی پاکستان کی پہلی پود جس نے آزادی کے بعد ملک کی بھاگ دوڑ سنبھالی، کو بطور مثال پیش کیا ہے۔ یہ طبقہ قیامِ پاکستان کے وقت نوجوان تھا اور بے کس و بے بس بھی نوزائیدہ مملکت میں ذمہ داریاں ملتے ہی اس طبقے نے اپنے سماجی حالات سنوارنے کا فیصلہ کر لیا۔ عرف عام میں ان ذمہ دار لوگوں کو بیوروکریسی کہتے ہیں۔ سیمی کہتی ہے کہ ہندوستان کی سیاسی صورتحال تبدیل ہونے کے بعد ہندو مسلم مسابقت ختم ہوتے ہی اس طبقہ نے اپنی سماجی حالت بہتر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طبقہ نے انگریز افسر شاہی جیسا رویہ اختیار کیا اور تجارت کے ساتھ خود کو وابستہ کر لیا جتنے بھی بڑے بڑے بیوروکریٹس ہیں کسی نہ کسی طور تجارت سے جڑے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی دولت میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ کچھ لوگ جو تجارت سے نہ جُڑ سکے وہ بینکنگ سسٹم سے جڑ گئے ان لوگوں نے جس سوچ کو پروان چڑھایا اس نے سماجی طور پر ملک کو دولت زدہ کر دیا۔ دولت جمع کرنے کی روش نے خود غرضی کی ایسی صورتِ حال پیدا کر دی جس نے اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا۔ سیمی کی زبانی بیان کردہ سماجی مسائل حقیقت پر مبنی ہیں خود سیمی انہی سماجی مسائل سے دوچار ہے اور وہ خود اس صورتِ حال کا احساس بھی رکھتی ہے جو اسے درپیش ہے لیکن وہ اس کا کوئی جامعہ حل تلاش کرنے میں بے بسی محسوس کرتی ہے۔

جیسا کہ ناول کا آغاز سوشیالوجی کی کلاس کے تعارفی لیکچر سے ہوتا ہے۔ کلاس کی سب لڑکیوں میں سیمی سب سے منفرد اور ذہین لڑکی ہے وہ ایک بیوروکریٹ کی بیٹی ہے اس لیے قومی اور بین الاقوامی جنرل نالج اور مسائل سے واقفیت رکھتی ہے۔ اس کی تربیت ایک آزاد خیال اور پُرآسائش ماحول میں ہوئی۔ اسے سوچنے سمجھنے اور رائے قائم کرنے کی آزادی حاصل رہی۔ یہی وجہ ہے کہ دانش

مندی اس کے افکار سے صاف جھلکتی ہے لیکن بلا کی خود اعتمادی نے اسے تھوڑا ضدی اور خود پسند بھی بنا دیا ہے۔ محبت کا جذبہ اس کے اندر کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آفتاب، قیوم اور پروفیسر سہیل سب اسے چاہتے اور اس کی قربت میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ وہ ایک ماڈرن لڑکی ہے جس نے زندگی کی ساری آسائشات حاصل کر رکھی تھیں، لیکن آفتاب کے افکار نے اس کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اپنا دل اسے دے بیٹھتی ہے۔ وہ ایک آزاد خیال اور بے باک لڑکی ہے جو اپنے خیالات کے اظہار سے قطعاً نہیں چوکتی یہی وجہ ہے کہ سب لوگوں نے اسے سمجھنے میں دھوکہ کھایا اور اس کے اندازِ گفتگو سے یہ سمجھا کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے حالانکہ وہ خوش مزاج ہونے کی وجہ سے سب سے خوش گوار انداز میں بات کرنے کی عادی تھی، لیکن آفتاب سے اسے حقیقی محبت ہوئی لیکن قیوم اور پروفیسر سہیل اگرچہ اس کو دل سے پسند کرتے تھے اور آفتاب کو گمراہ کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے آفتاب کے دل میں شک کا جو بیج بویا اس نے ان دونوں کی محبت میں ایسی دراڑ ڈالی کہ جس کے بعد سیمی کی زندگی میں مسائل بڑھتے چلے گئے اور آخر کار اس کو خودکشی کر کے زندگی سے چھٹکارہ حاصل کرنا پڑا۔ آفتاب سے بچھڑنے کے بعد وہ کس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی اور صدمے میں چلی گئی اس کا اظہار بانو قدسیہ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

> ”ادراصل آفتاب سے بچھڑ کر سیمی کشش ثقل سے آزاد ہو گئی تھی۔۔۔ لیکن کشش ثقل سے آزاد رہنے کے بعد جو بے سمتی پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں اسے کوئی باقاعدہ ٹریننگ نہ ملی تھی۔ وہ گویا ان دونوں مافیا تلے سانس لے رہی تھی جہاں بیٹھ جاتی پہروں بیٹھی رہتی۔ کہیں جب اس کی نظر جم جاتی تو پھر چینی کی گڑیا کی طرح اس طرف دیکھتی جاتی۔ ایسے میں آفتاب کے نام کے علاوہ اور کوئی ٹیکہ کارگر نہ ہوتا۔ اس خلائی دَور سے کئی کیفیتیں وابستہ ہوئیں۔ خود ترسی، بیزاری، تنہائی پسندی، مردم گزیدہ محرومی غرضیکہ آفتاب کی کشش باقی نہ رہی تو کئی سمتیں پیدا ہوئیں۔۔۔ لیکن ہر سمت کے آگے ہمیشہ خلا ہوتا، خاموشی ہوتی۔۔۔ اندر کا پریشر بڑھتا چلا جاتا۔“(۳)

قیوم نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن وہ جس طرز کی محبت کرتا رہا تھا سیمی اس سے بالکل مختلف تھی۔ دوسرا اس کے ذہن سے آفتاب کی یاد ہرگز نہ ہٹتی تھی حتیٰ کہ وہ قیوم سے ہمیشہ آفتاب کی باتیں کرتی تھی اور آفتاب کی شادی کے بعد وہ عشق لاحاصل کی مرض میں اس طرح مبتلا ہوئی کہ خودکشی کرنے کے علاوہ اس کو کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ قیوم سے سیمی کی محبت کا مقصد دردِ دل کا اظہار تھا جو ان الفاظ میں عیاں ہوتا ہے۔

> ”شکر ہے لاہور میں تم ہو قیوم۔۔۔ اگر تم نہ ہوتے تو میں آفتاب کی باتیں کس سے کرتی۔ تم میری بڑی ضرورت بن گئے ہو قیوم۔۔۔ سچی میں کسی حیدر کے ساتھ اَب نہیں رہ سکتی۔۔۔ کیا کسی وقت آفتاب بھی مجھے اسی شدت سے یاد کرتا ہو گا۔“(۴)

بعض لوگ اتنے معصوم اور کھرے ہوتے ہیں جو کہ جس سے جتنی بات کرتے اور جو اظہار کرتے ہیں اس میں پوری سچائی ہوتی ہے، لیکن معاشرہ اور روزمرہ حالات وواقعات سے حاصل ہونے والے نتائج دوسرے لوگوں کو خود اعتمادی اور یقین کی قوت سے محروم کر دیتے ہیں۔ یہی صورتحال آفتاب کے ساتھ پیش آئی اور سیمی کو ایک ایسے صدمے سے گزرنا پڑا جس سے گزرنے کی اعلیٰ طبقے کی خود اعتمادی اور سچے جذبات کی حامل سیمی جیسی لڑکیوں کو تاب نہیں ہوتی۔ پاکستان کی سرزمین پر ابتدائی سالوں میں طبقاتی کشمکش کی جو صورتحال تھی۔ سیمی کا المیہ اسی طبقاتی کشمکش کا ثمر تھا اور اسی Confict یا تضاد کا وہ خود شکار ہوئی اور ہمارے معاشرے میں اپر کلاس

میں انہی تضادات کا شکار ہزاروں لڑکیاں ملیں گی۔ سیمی ان کا صرف ایک عکس ہے۔ اس اپر کلاس میں روایات، تعلقات اور اقدار میں سے کچھ بھی باقی نہ بچا تھا یہی وجہ ہے کہ وہ خود کو تنہا محسوس کرنے لگی اور اسی تنہائی میں گھر سے دوری اختیار کر کے کسمپرسی کا شکار ہو گئی۔ سیمی کا باپ اس کی جذباتی کیفیت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ ماں باپ، دوستوں ہر طرف سے مایوسی نے اسے ایک بند گلی میں دھکیل دیا جہاں سے واپسی کے لیے وہ کوئی راستہ تلاش نہ کر سکی۔ قیوم اس ناول کا ایک مرکزی کردار ہے اور ایسے افراد کی نمائندگی کرتا ہے جو کہ ایک کمزور اور پسے ہوئے طبقے میں آنکھ کھولتے ہیں لیکن زندگی کی بے کسی اور آسائشات کی آرزو میں ناکامی انہیں احساس کمتری میں مبتلا کر دیتی ہے اس کے اپنے الفاظ میں:

> "اسکول میں بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بنچ پر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگے تھے۔۔۔ میرے دل کی بنچ پر ماسٹر غلام رسول کے ساتھ کئی قدر آور شخصیتیں کھڑی تھیں۔ اسی تضاد کے باعث میں عمر میں بڑھنے کے باوجود اندر سے نہ بڑھ سکا اور میری شخصیت ایک ایسے درخت جیسی ہو گئی جیسے زیبائش کے لیے جاپان میں پالا جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔"(۵)

قیوم جس صورتِ حال سے دوچار ہے یہ صورتحال اس کو سماجی ناہمواریوں کی وجہ سے درپیش ہے۔ ہماری سماجی صورتِ حال انتہائی نہ گفتہ بہ ہے اور ہماری زندگی میں ہمیں قیوم جیسے کردار اکثر دِکھائی دیتے ہیں۔ ہمارا معاشرہ اچھے اُستاد اور مبلغ پیدا کرنے میں کچھ مسائل کا شکار ہے۔ قیوم کو دراصل ابتدائی زندگی سے مناسب تربیت اور راہنمائی حاصل نہ ہو سکی جو اس کی صحیح خطوط پر شعوری پرورش کو ممکن بناتی۔ نتیجتاً اس کی طبیعت میں جو احساسِ کمتری کا عنصر شامل کیا اس نے نہ صرف اس کی زندگی برباد کر دی بلکہ اس نے دیگر لوگوں کو بھی مسائل کا شکار کیا۔ سکول کی زندگی میں قیوم کو جس تربیت کی ضرورت تھی وہ اس کو حاصل نہ ہو سکی کیوں کہ اس کے اساتذہ بذاتِ خود اتنے تضادات کا شکار تھے کہ قیوم کو اس احساس کمتری سے نکالنے کی بجائے مزید اُلجھانے کا باعث بنے۔ اسی اُلجھاؤ کی طرف اشارہ کرتے وہ اعتراف شکست ان الفاظ میں کرتا ہے:

> "میرا خیال تھا کہ اگر آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہونے کا راستہ نہ ہو تو دل تک جانے کے اور بھی کئی راستے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ دل کو صرف ایک راہ جاتی ہے اور وہ جسم کا راستہ نہیں ہے۔"(۶)

قیوم سیمی سے پہلے بھی کئی لڑکیوں سے جسمانی قربت رکھتا تھا اور اس کے دل کے مہمان بدلتے رہتے تھے، لیکن سیمی کی بات ہی الگ تھی جب سیمی اس کی طرف لوٹ کر آئی تو قیوم نے اس کا دل جیتنے کے لیے آفتاب بننے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا وہ اس کے جسم کو فتح کرنے میں تو کامیاب رہا لیکن اس کی روح کو فتح نہ کر سکا۔ اس کا واضح ثبوت سیمی کے ان الفاظ کی صورت میں سامنے آتا ہے:

> "میں نے خفگی سے کہا۔۔۔ ہم بھی تو ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں سیمی، ہمیں کوئی محبت تھوڑی ہے۔۔۔۔۔ قیوم؟۔۔۔۔۔۔ ہیں قیوم۔"(۷)

اس صورتحال نے قیوم کو زبردست ہیجان میں مبتلا کر دیا۔ اِسی دوران سیمی کی موت ہو گئی۔ پروفیسر سہیل نے اس کی نفسیاتی صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے اسے یوگا کرنے کا مشورہ دیا لیکن قیوم کی صحت پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا بلکہ وہ ایک شادی شدہ عورت عابدہ کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن عابدہ سے جنسی تعلق قائم کرنے کے بعد اس کی اُلجھنیں ختم نہ ہو سکیں بلکہ وہ مسلسل ذہنی و جسمانی انتشار کا شکار ہوتا چلا گیا۔ اس نے عابدہ کے جانے کے بعد مسلسل خود کو مصروف رکھنے، اپنا دھیان بٹانے اور ماضی کی یادوں سے چھٹکارہ پانے کی کوشش کی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ریڈیو کی ملازمت اختیار کرنے سے معمولات کا اثر نظم و ضبط میں کچھ بہتری کی صورت میں ابھرا لیکن امتل سے ملاقات کے بعد اس نے اپنی تنہائی دور کرنے کی کوشش کی جو کہ وقتی ثابت ہوئی ہے اور اس کی تنہائی ختم نہیں ہو پاتی۔ امتل کے قتل نے اسے ایک بار پھر پہلے والی صورتِ حال پر لا کھڑا کیا۔ اس بار جو صدمہ اس کو پہنچا وہ جان لیوا ثابت ہوا اسے السر اور Anxity اور ڈپریشن نے زبردست اٹیک کیا۔ اپنی ذہنی کیفیت کا احوال یوں بیان کرتے ہیں:

> "صبح شیو کرتے مجھے اپنی شکل یوں نظر آتی جیسے روشنی کی سفید کرن طیف منشوری میں سے نکل کر سات رنگوں میں بدل جاتی ہے۔ سادہ شیشے میں میری شکل کئی شکلوں میں منتقل ہو جاتی۔ کسی عکس میں مونچھ غائب ہوتی کسی حصے میں بامیز بادشاہ جیسی داڑھی نظر آتی۔ کبھی کبھی اوپر والے ہونٹ پر لپ اسٹک کا لیپ ہوتا۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی ہوتی۔ کبھی کسی چہرے کی آنکھیں غائب ہوتیں۔ آئینے میں نظر آنے والی صورتوں میں سے خوف زدہ ہو جاتا۔ پھر میں الماری کھول کر اندر دیکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ الماری میں ٹرنک کے اندر گدے کے نیچے مجھ سے مشابہ کئی بونے رہتے ہیں اور کسی دن مجھے اکیلا پا کر وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو جائیں گے۔"(۸)

اپنی جنونی حالت کو قابو کرنے کے لیے قیوم روشن نامی ایک لڑکی سے شادی کر لیتا ہے لیکن شادی کی پہلی رات ہی اس پر یہ راز منکشف ہو جاتا ہے کہ یہ لڑکی بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اس کی اپنی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ وہ روشن کو تسلی دیتا ہے اس پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے اور پانچ دن بعد ہوش آتا ہے۔ روشن کو طلاق دے کر رخصت کرنے کے بعد اس کے ہوش و حواس جاتے رہتے ہیں۔ قیوم کی صورتحال اخلاقی دیوالیہ پن اور جنسی بے راہ روی کا منطقی انجام ہے۔ علامتی طور پر "راجہ گِدھ" کی کہانی کا اطلاق بانو قدسیہ نے قیوم پر کیا ہے۔ وہ سیمی کی محبت میں گرفتار ہو کر عشق لاحاصل میں گرفتار ہوا، لیکن عشق لاحاصل کی منفی دیوانگی اس کے حصہ میں آئی۔ اس نے منفی راستے اختیار کر کے سکون حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ساری زندگی محرومیوں سے بھری ہوئی تھی۔ گاؤں کا ماحول، خاندانی زندگی، تعلیمی پس منظر، اخلاقی تربیت سب اسے منفی راستوں پر چلنے سے باز رکھنے میں ناکام رہے۔ وہ جس دیوانگی کا شکار ہوا آخر تک اسے روحانی سکون کے لیے استعمال کرتا رہا لیکن درست سمت اختیار نہ کر سکا۔ مردار خوری اس کی فطرت کا حصہ بن گئی جس کی وجہ سے مایوسی، بے بسی، زندگی کی تلخیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کا مقدر ٹھہریں۔

اس ناول کا ایک اہم کردار عابدہ ہے جو کہ ایک شادی شدہ لڑکی ہے لیکن اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اپنے بھائی کے ہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ اس کی تربیت اتنے سخت ماحول میں ہوئی تھی جس میں اس کی اپنی شخصیت دب کر رہ گئی تھی۔ وہ قیوم سے سیمی کی باتیں کرتی تو قیوم کی حالت اسے قابلِ رحم لگتی ہے۔ اسے حیرت ہوتی ہے کہ قیوم یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ کسی اور سے محبت کرتی تھی اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ قیوم سے صرف اس لیے قربت چاہتی تھی کہ ایک بچے کی ماں بن سکے لیکن احساسِ گناہ نے اسے قیوم سے تعلق برقرار رکھنے سے باز رکھا، لیکن مجموعی طور پر اس کی شخصیت تضادات کا شکار رہی جو نصب العین سے عاری تھی۔

بانو قدسیہ کا کردار امتل ایک طوائف کی زندگی اور افکار کی نمائندگی کرتا ہے۔ قیوم سے اس کی ملاقات ریڈیو اسٹیشن پر اتفاقاً ہوتی ہے۔ وہ جس ماحول میں پروان چڑھی تھی وہاں جسم محض جنسی آسودگی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ماضی میں وہ ریڈیو آرٹسٹ رہی تھی جس پس منظر سے وہ تعلق رکھتی تھی وہاں دِلوں کو شکار کرنا ایک مشغلہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کی تربیت ہی ایسے انداز میں کی گئی تھی۔ وہ ایک بھٹکی ہوئی روح دِکھائی دیتی تھی وہ اپنے مکر و فریب کے ذریعے بظاہر سادگی کے ساتھ قیوم کو بہلانے پھسلانے میں کامیاب رہی۔ اس کی زندگی اس مکر و فریب میں گزری تھی اور اب وہ زندگی کے اس حصے میں تھی جہاں ماضی کا سارا تجربہ اس کی شخصیت سے صاف جھلکتا تھا۔ وہ اب اس احساس کا شکار تھی کہ ماضی میں اس کو استحصال کا نشانہ بننا پڑا ہے لیکن یہ استحصال اس کی اپنی آمادگی سے کیا گیا تھا۔ اس کا بیٹا اس کو قتل کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی موت اپنی خواہش کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ اقتباس دیکھئے:

> ''اور تم نے کیا دُعا مانگی ہے امتل؟ بس یہی۔۔۔۔ یہی سرجی زندگی تو کسی پیار والے کے ساتھ گذری نہیں۔ اب موت تو کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔۔۔ موت تو حلال ہو میری۔''(۹)

امتل ایک ایسا کردار ہے جس کے ذریعے طوائف الملوکی کا شکار ہمارے سماج کی خواتین کے مسائل اُجاگر ہوتے ہیں۔ یہ خواتین اپنی خوشی سے کم ہی ایسا کردار بننے پر تیار ہوتی ہیں یقیناً معاشرہ سماجی ناہمواریوں کے ذریعے خواتین کو اس قدر متاثر کرتا ہے کہ وہ اس طرح کی بھیانک زندگی جینے پر مجبور ہو جاتی ہیں یہ ایک بہت بڑا سماجی مسئلہ ہے۔ پروفیسر سہیل کا کردار اس ناول کا ایک اور اہم کردار ہے۔ ناول کی سٹوری میں پروفیسر سہیل ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوثر کی زبانی یہ راز کھلتا ہے کہ وہ بھی سیمی کی محبت میں آفتاب اور قیوم ہی کی طرح گھرے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ اُنھوں نے ہی آفتاب کو سیمی سے بدظن کرنے کے لیے یہ کہا تھا کہ وہ وفا کی دیوی نہیں ہو سکتی۔ جس سے اس کی شخصی کمزوریاں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اُسلوب انصاری، سہیل کے نظریات کا تجزیہ کرتے ہیں:

> ''سہیل کے کردار کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ سماجیات اور سائنس کی دنیاؤں کی خاک چھاننے کے بعد روح کی کائنات کی تفتیش اور جستجو میں منہمک ہو جاتا ہے اور بعض غیر تقلیدی نظریات کا اظہار شدومد اور بھرپور ایمان و اتفاق کے ساتھ کرنے لگتا ہے۔ اس کا حتمی خیال ہے کہ جسم کی کثافت روح کو بھی کثیف اور غیر مظہر بنا کر چھوڑتی ہے۔''(۱۰)

ناول کے ہر دوسرے باب میں جانوروں کی کانفرنس کا احوال بیان کرتے ہوئے بانو قدسیہ نے تمثیلی انداز اختیار کیا ہے۔ "راجہ گِدھ" کی مردار کھانے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی دیوانگی موضوع بحث بنی رہتی ہے۔ جانوروں کے اس موضوع پر خیالات کا اطلاق انسانی صورتِ حال جو انسانی اخلاقی اور معاشرتی بگاڑ اور عالمی سطح پر غلبہ پانے اور طاقت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیے جانے والے ہتھکنڈوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مالی وسائل پر قبضہ کی غرض سے بھونڈے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہوئے امریکی اتحاد نے جس طرح کئی دہائیوں سے کئی ثقافتوں، تہذیبوں اور حکومتوں کو گرایا اور وہاں کے وسائل کو دہشت گردوں سے بچانے کی بھونڈی دلیل پیش کر کے اپنے مفاد کے لیے اور خصوصاً اسلامی ممالک میں انتشار پھیلانے کے لیے استعمال کیا راجہ گدھ کی منعقد ہونے والی کانفرنسوں کی گفتگو میں اس کے مضر اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ غریب ممالک کے برسر اقتدار بعض لوگوں کو اپنا آلہ کار بنا کر ان ممالک کی زندگی کو استحصال کا نشانہ بنایا گیا اور ان افراد کو اپنی ناجائز دولت مغربی ممالک کے بینکوں میں محفوظ کرنے کی سہولت دی

گئی، لیکن ان سب صاحبِ اقتدار لوگوں کو مقصد حاصل ہونے کے بعد عبرت کا نشان بنا دیا گیا اس کی واضح مثال کرنل قذافی، حسنی مبارک اور صدام حسین کے انجام کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ اس کے علاوہ بھی عالمی سیاسی منظر نامے سے بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ناول کا پہلا حصہ جو عشق لاحاصل کے موضوع پر ہے اس میں سیمی کی صورتِ حال کے تناظر میں رزقِ حرام کے اثرات کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> "ناول میں محبت قلب ماہیئت کرنے والا عمل ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے گلبرگ کی جین پہننے والی اور گاگل لگانے والی سیمی شاہ ناکام محبت کے بعد آفتاب کے نام کی مالا جپتے جپتے میرابائی کی طرح جوگن بن جاتی ہے۔ ایسی جوگن جس کا خارج الٹرا ماڈرن لڑکی کا ہے، مگر جو من میں سلگتی برہا کی اگنی میں ایک دن جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ مصنفہ نے سیمی کی موت کو عشق لاحاصل کی طبعی موت خودکشی یا دیوانہ پن کی "معراج" قرار دیا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ عشق لاحاصل ہی ہے جو سیمی کے کردار کے بلند ترین خصائص اُجاگر کرتا ہے۔"(۱۱)

قیوم کی دیوانگی کے حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر تجزیہ پیش کرتے ہیں:

> "یہی عشق لاحاصل ہے جو قیوم کے اندر گِدھ کو بیدار کر کے اس کے کرداری زوال کی کہانی کو جنم دیتا ہے۔ ایسا زوال جس کی انتہا میں وہ پستی کی اس حد تک چلا جاتا ہے کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی منکوحہ کو اس کے عاشق کے حوالے کر دیتا ہے۔"(۱۲)

بانو قدسیہ نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عشق لاحاصل آرزوؤں کی تلاش میں انسان اپنی سمت کا تعین کرنے کی صلاحت کھو بیٹھا ہے۔ "میرا جسم میری مرضی" کا نظریہ عورت کی آزادی کی ایسی خواہش بھی اسی ذیل میں آتی ہے۔ یہی خواہشات انسان کو ذہنی و روحانی طور پر مفلوج کر دیتی ہیں۔ یہ خواہشات لاحاصل محبت کی ہوں یا دولت کی، رزقِ حرام ہی کی ایک صورت ہیں۔ بانو قدسیہ نے ایک اور تصویر جو پرندوں کی کانفرنس میں گیدڑ کی زبان سے پیش کیا ہے جو کہ گدھ کا وکیل بن کر دلائل دیتے ہوئے بیان کرتا ہے وہ متناہی تجسس کو دیوانگی کا سبب گردانتا ہے۔

> "دیوانگی کا عشق لاحاصل سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ دیوانگی تلاش سے پیدا ہوتی ہے۔ مسلسل نئے سوالوں کے ناتسلی بخش جواب۔۔۔ تھکا دینے والی جستجو دیوانہ کرتی ہے۔"(۱۳)

انسان اپنی خواہشات جو نامکمل رہ جاتی ہیں کی جستجو میں لگا رہتا ہے اور یہ جستجو جب روحانیت سے ہٹ کر سیکولرزم کی طرف مائل ہوتے ہی منفی اثرات کا سبب بنتا ہے۔ قیوم کا کردار اس تصور کی عملی پیشکش ہے۔ وہ اپنی ذہنی غلاظت سے نکلنے کے لیے پروفیسر قیوم کے مشورے پر یوگا کرنے کی طرف متوجہ ہوا لیکن یہ اسے جنس کے راستے پر لے گیا۔ بانو قدسیہ نے بعض خیالات جو انسان کو ان سماجی مسائل میں اُلجھنے کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں سے باہر نکلنے کے لیے تصوف کا سہارا لیا ہے اور یہ پیغام دیا ہے کہ اگر انسان مقصدیت کی صحیح راہ تلاش کرے تو جدید دَور کے ان مسائل سے چھٹکارہ پا سکتا ہے۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ مشن کی مقصدیت ذہن میں ارتکاز پیدا کر کے روح کو تقویت بخشتی ہے۔ پروفیسر سہیل کے الفاظ میں:

> "تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہو گی۔۔۔ کوئی مشن اپنانا پڑے گا، کوئی گول، کوئی منزل۔۔۔ ورنہ تم خالی بجرے کی طرح سمندری لہروں میں بھٹکو گے۔۔۔ کبھی بحر قلزم میں، کبھی بحیرہ عرب

میں۔۔۔ اپنے اِرد گرد دیکھو۔۔۔ جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنا لیتے ہیں، چاہے چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو، ول السر کا شکار نہیں ہوتے۔۔۔ پیغمبروں کی زندگی غور سے دیکھو، وہ بڑی سے بڑی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوتے۔۔۔ کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی۔۔۔ بے نام جستجو، بے مصرف تلاش نہ ہو۔۔۔ زندگی میں ایک مشن ہو، چاہے بالکل چھوٹا سا۔ مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا۔۔۔ پاکستان کے لیے نئی قسم کی گندم بونا۔۔۔ پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بننا۔۔۔ کسی بچے کو سی ایس پی کرانا۔۔۔ بھائی میرے۔۔۔ بیمار ذہن کے مالک، کسی کے فائدے کے لیے مشن نہیں ہوتا۔۔۔ اس کا فائدہ ہمیشہ مشن والے کو ہوتا ہے۔۔۔ بڑے سے بڑا مشن ہو کائناتی قسم کا تو آدمی اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔ گھٹیا کو الٹی کا آدم سائز ہو تو اپنے آپ کو آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔"(۱۴)

ناول کا آخری حصہ موت کے فلسفہ پر مشتمل ہے۔ ناول میں سب سے پہلے سیمی کی موت پھر امتل کی موت اور پھر قیوم کی موت۔ قیوم اپنی موت سے قبل موت جیسی ایک بڑی حقیقت سے واقف ہو چکا تھا اس کے ذہن پھر موت و حیات کی اس کشمکش کا تصور غالب رہنے لگا تھا وہ ہر وقت انسان کی زندگی کے اس سفر پر غور و فکر کرتا رہتا اور سوچتا کہ کیا نجات صرف موت کی صورت میں ممکن ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ موت سے قبل ہی نجات مِل جائے۔ اسی سوال کی تلاش میں وہ آخر کار "سائیں بابا" کے دربار تک پہنچتا ہے لیکن اپنے سوال کا جواب تلاش نہیں کر پاتا۔

پروفیسر سہیل خود سماجی مسائل کا شکار ہیں۔ ہمارے اساتذہ کرام کو وہ عزت و احترام نہیں دیا جاتا نہ ہی درس و تدریس کی پوری آزادی فراہم کی جاتی ہے جس کے نتیجے میں وہ ہمیشہ عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر سہیل اپنی کلاس میں طلباء کے جوش و خروش کے نتیجے میں پیدا ہونے والے شور پر اس دلیل کے ساتھ طلباء کو آوازیں آہستہ رکھنے کا کہتے ہیں کہ انتظامیہ ڈسپلن کے فقدان کی وجہ سے انھیں یونیورسٹی سے نکال ہی نہ دے۔ یہ صورتحال بھی ایک نہایت اہم سوال کھڑا کرتی ہے۔ رزقِ حرام اور رزقِ حلال کا فلسفہ، رزقِ حرام کے انسانی جینز پر اثرات کا تصور ناول نگار نے پروفیسر سہیل کے ذریعے قاری تک منتقل کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی جینز کو متاثر کرتا ہے۔ رزق حرام سے ایک خاص قسم کی Mutation ہوتی ہے جو خطرناک ادویات، شراب اور Radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے۔ رزقِ حرام سے جو جینز تغیر پذیر ہوتے ہیں وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ نا اُمید بھی ہوتے ہیں۔ نسل انسانی سے یہ جینز جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان Genes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کر لو رزقِ حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے۔ وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں۔"(۱۵)

مصنفہ پرندوں کی زبانی اسلامی نظریہ حیات کی اساس بیان کرتی نظر آتی ہیں اور پرندوں کی زبانی کہتی ہیں کہ ہم رزق حرام کے خلاف ہیں، کیوں کہ رزق حرام جب خون میں شامل ہو کر رگوں میں پھرتا ہے تو دیوانگی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ رزقِ حلال روح کو توانائی بخشتا ہے جب کہ رزقِ حرام جیسے ہی جسم میں داخل ہوتا ہے روح کو آلودہ کر دیتا ہے۔ حرام حلال کی تمیز یہ بیان کی گئی ہے کہ جس سے اللہ تعالیٰ منع فرمائے بس وہ رزق حرام ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرمائے وہ رزقِ حلال ہے۔ رزق حلال انسان کو روحانیت کی معراج تک پہنچاتا ہے۔ رزق حرام انسان کی روح کو آلودہ کرتا ہے جو دیوانگی کا شکار ہو جاتی ہے اور ہلاکت خیزی کا باعث بنتی ہے۔ دوسری طرف مصنفہ یہ تصور بھی پیش کرتی ہے کہ دیوانہ پن اگرچہ ارتقاء کی علامت ہے اور اسی دیوانہ پن نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ پر فائض کیا لیکن رزقِ حرام جیسے ہی انسانی جسم کا حصہ بنتا ہے انسانی روح کو اس قدر پامال کر دیتا ہے کہ دو دوسرے انسانوں کے لیے تباہی و بربادی کا سامان اکٹھا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

> ”انسان تمدن کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر قلابازی کھا گیا تھا۔ اس نے اپنے ہی لوگوں کے لیے ایسے بم ایجاد کیے تھے جن سے نہ صرف انسان ہلاک ہوتا ہے بلکہ عورت کا رحم بچہ بنانے اور مرد کا عضو تناسل بیج بونے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ اس نے شہروں پر ایسے بم پھینکے کہ میٹھے پانیوں کے ایٹم پھٹ کر زہر میں تبدیل ہو گئے۔ پھر جس نے اس پانی کو چکھا۔ وہ اوّلین گھونٹ کے ساتھ جاں بحق ہوا۔۔۔“(۱۶)

ناول کے آخری حصہ میں بانو قدسیہ نے ایک ایسا کردار تخلیق کیا ہے جو دیوانگی کی مثبت سمت کی نمائندگی کرتا ہے۔ آفتاب لندن سے واپس لوٹتا ہے تو اس کا بیٹا ابراہیم اس کے ساتھ واپس آتا ہے۔ جو ایک خاص قسم کی دیوانگی کا شکار ہوتا ہے جو کہ نہ تو عشق لاحاصل سے پیدا ہوئی تھی اور نہ ہی لامتناہی تجسس سے بلکہ یہ ایک الگ قسم کی دیوانگی تھی جسے مصنفہ مقدس دیوانگی سے تعبیر کرتی ہے، جو ایک خاص قسم کے طیب رزق سے پیدا ہوتی ہے اور جس کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ یہ خدا کی عنایت ہوتی ہے اور خدا جسے چاہے اس سے سرفراز کرتا ہے۔ مصنفہ کا خیال ہے کہ انسان اس قسم کی دیوانگی کا ادراک کرنے کی خوبی نہیں رکھتا اس کا راز صرف اللہ جانتا ہے۔ ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> ”ناول میں بانو نے انسان کی تخلیق، اس کے ذہنی و فکری ارتقاء اور اس کی جنسی نفسیات، اس کی تہذیب اور مذہب اور تصوف کے حوالوں سے کائنات میں اس کے مقام سے بحث کی ہے، مگر ان سب باتوں کا تانا بانا وہ فکری لحاظ سے تصوف و روحانیت سے جوڑ دیتی ہیں اور اپنے ایک اہم کردار پروفیسر سہیل کی وساطت سے قاری پر یہ تاثر چھوڑتی ہیں کہ ہمارے تمام تر معاشرتی عوارض کا حل روحانیت میں پوشیدہ ہے اور یہ کہ ہماری بداعمالیوں اور مغربی فلسفوں نے ہماری روح پر جو زخم ڈالے ہیں، ان کا علاج فرائڈ کے نسخوں میں نہیں ملے گا، کیونکہ اس کا طریقہ علاج روحانیت کو انسانی ذات سے خارج کر کے وضع کیا گیا ہے۔“(۱۷)

مغربی افکار نے دولت کے ارتکاز کے لیے جو قوانین وضع کیے اور انسان کو مادی زندگی کا جو درس دیا ہے اس نے انسانی تہذیب و تمدن، سماجی زندگی، معاشرت، نظریہ زندگی پر اس قدر منفی اثرات مرتب کیے کہ ساری دنیا کے سارے معاشرے طبقاتی کشمکش کا شکار ہو گئے یہ طبقاتی کشمکش صرف مادی زندگی پر ہی منفی طور پر اثرانداز نہیں ہوئی بلکہ اس کے نتیجے میں شدید جنسی، روحانی اور

سماجی انتشار پیدا ہوا۔ آج دنیا واضح طور پر دو طبقوں میں تقسیم دِکھائی دیتی ہے۔ یہ تقسیم معاشرے کے افراد پر زہر آلود اثرات کی اس نہج پر کھڑی ہے کہ نہ صرف اقوام طبقات میں تقسیم ہوئیں بلکہ خاندان، گروہ اور افراد تک طبقاتی گروہ بندی کا شکار ہوئے۔ ایک ہی خاندان کے افراد ایک دوسرے سے اس قدر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئے کہ ایک گھر کی چار دیواری میں بسنے والے سارے افراد اپنے اپنے طور پر تقسیم اور منتشر ذہنی حالت میں بٹ گئے جس نے ہمارے معاشرے میں بہت بڑا خلاء پیدا کر دیا۔ اتنا بڑا خلاء کہ جس کو بھرنا اور پُر کرنا ناممکن ہو گیا ہے، لیکن ناول میں پیش کردہ تصورات جو اس صورتحال سے معاشرے کو نکالنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں جو ہماری مذہبی تعلیمات کے بھی عین مطابق ہیں اور ہماری عظیم سماجی روایات کے ساتھ بھی مطابقت رکھتے ہیں۔

بانو قدسیہ نے اس ناول میں ہمارے جن مسائل کی نشاندہی کی ہے وہ ہماری سماجی زندگی کے بہت سے معاملات میں سماجی انتشار کی نشاندہی کرتے ہیں۔ دولت کی ہوس، عہدوں کا لالچ، رشوت، جنسی ہیجان، عدم مساوات، اقدار سے روگردانی، بے راہ روی، عدم اطمینان، دوسروں کے حقوق پر قبضہ جیسی بے شمار برائیاں اسی سماجی انتشار کا نتیجہ ہیں۔ یہ ہمارے اپنے معاشرے کی صورتحال ہے جہاں انسانیت کا تقدس اپنی معنویت کھو چکا ہے اور مسائل کا گرداب معاشرے کی جڑوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔ یہ صورتحال اچانک پیدا نہیں ہوئی بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے یہ سماجی مسائل مسلسل بڑھتے چلے جا رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو ہمارا تعلیمی نظام صحیح خطوط پر معاشرے کی تربیت کر سکا ہے نہ ہی ہمارا سیاسی ڈھانچہ ملک میں انصاف کی فراہمی اور قانون کی بالادستی کے لیے اقدامات کر سکا ہے۔ عدالتیں غریب لوگوں کے مسائل کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ انصاف کی عدم فراہمی کے نتیجے میں ہمارے سماجی مسائل وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور پھیلتے جا رہے ہیں اور مصنفہ نے اسی طرف قاری کی توجہ مرکوز کرواتے ہوئے غور و فکر کی نئی راہیں کھولنے کا کامیاب کوشش کی ہے تاکہ مسائل کو حل کیا جا سکے۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے بدلتے تناظر، کراچی، ویلکم بک لمیٹڈ، ۱۹۹۳ء، ص: ۱۹۴

۲۔ وارث علوی، مضمون نگار (بانو قدسیہ کا ناول راجہ گِدھ)، رسالہ "سوغات"، شمارہ ۳، ص: ۴۷

۳۔ بانو قدسیہ، راجہ گِدھ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص: ۱۷۰

۴۔ ایضاً، ص: ۱۴۴، ۱۴۳

۵۔ ایضاً، ص: ۱۸

۶۔ ایضاً، ص: ۱۱۳

۷۔ ایضاً، ص: ۱۲۶

۸۔ ایضاً، ص: ۳۸۶

۹۔ ایضاً، ص: ۳۸۵

۱۰۔ انصاری، اسلوب احمد، اُردو کے پندرہ ناول، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۰۲ء، ص: ۳۲۷

۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، ادبی جائزے، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ص: ۵۲، ۵۱

۱۲۔ ایضاً، ص: ۵۲

۱۳۔ بانو قدسیہ، راجہ گدھ، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء، ص:۳۱

۱۴۔ ایضاً، ص:۳۷۴

۱۵۔ ا ایضاً، ص:۲۷۶

۱۶۔ ایضاً، ص:۲۷۶

۱۷۔ ممتاز احمد خان، راجہ گدھ- نظریاتی کمٹمنٹ کا ناول، (مشمولہ) اُردو ناول کے بدلتے تناظر، کراچی، ویلکم بک پورٹ لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص:۲۶۸

References in Roman Script:

1. Mumtaz Ahmad Khan, Dr.,Urdu Novel Kay Badaltay Tanazur, Karachi, Welcome Book Limited, 1993, p.194
2. Waris Alvi, Mazmoon Nigaar (Bano Qudsia's Novel Raja Gidh), Magazine "Sogaat", Issue 3, p:47
3. Bano Qudsia, Raja Gidh, Lahore, Sang-e-Mail Publications, 2002, p: 170
4. Ibid, p:143-144
5. Ibid, p:18
6. Ibid, p:113
7. Ibid, p: 126
8. Ibid, p:386
9. Ibid, p:385
10. Ansari, Aslob Ahmad, Fifteen Novels of Urdu, Aligarh, Educational Book House Aligarh, 2002, p.327
11. Salim Akhtar, Dr., Literary Reviews, Lahore, Sang-e-Meel Publications, p: 51, 52
12. Ibid, p:52
13. Bano Qudsia, Raja Gadh, Lahore, Sang-e-Meel Publications, 2002, p:31
14. Ibid, p:374
15. Ibid, p: 276
16. Ibid, p: 276
17. Mumtaz Ahmad Khan, Raja Gadh-Nazryati Commitment Ka Novel, (Mashmola), Urdu Novel Kay Badaltay Tanazur, Karachi, Welcome Bookport Limited, Karachi, 1993, p:268